حضرت العلام حافظ محمد صاحب گوندلوی مدظلہ العالی

دوام حدیث (قسط ۱)

ایک اسلام

منکر حدیث:

"اسی چیز نے مجھے بچایا۔ اگر میں کسی شیخ الحدیث کے اڑنگے پہ چڑھ جاتا تو وہ مجھے اقلیم حقائق سے بہت دور اوہام وظنون کی دنیا میں لے جاکر وہ پٹخنی دیتا کہ میرا سر اور نظر ہر دو آب کی طرح چکرا جاتے اور میں اس بھول بھلیاں سے کبھی نہ نکل سکتا۔"

قائل حدیث:

اصل حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ چونکہ آپ نے کسی استاد سے تو حدیث نہیں پڑھی اور قرآن کا بھی یہی حال ہو گیا۔ صرف منکرین حدیث کے رسائل کی واقفیت ہی آپ کی تحقیق کا منتہا ہیں، اسی واسطے آپ نے قرآن کی آیتوں کے لکھنے میں بھی غلطی کی اور حدیث کے ترجمہ میں بھی غلط بیانی سے کام لیتے رہے، یہ مقولہ نہایت درست ہے:

"من کان شیخہ الکتاب فغلطہ اکثر من الثواب"

کہ جس کا استاد کتاب ہو وہ غلط باتیں زیادہ کرتا ہے اور ٹھیک کم!

اب بھی وقت ہے سنبھل جائیے، کسی شیخ الحدیث سے تحقیق کر لیجئے اور اس کے اڑنگے سے نہ ڈریئے، اپنے آپ کو اتنا بے وقوف نہ بنائیے کہ کوئی ملا آپ کو پٹخنی دے کر آپکا

سراور نظر دونوں کو چکرا دے اور آپ جس کو بھول بھلیاں سمجھ رہے ہیں، وہ حقائق و معارف نظر آنے لگیں۔

چھٹا باب

(تحریف احادیث کے اسباب)

مصنف نے تحریف احادیث کے آٹھ اسباب بیان کئے ہیں:

۱۔ کتابتِ حدیث کی ممانعت

۲۔ آسان اسلام

۳۔ طریقت

۴۔ بادشاہوں کی خوشامد

۵۔ فرقہ پرستی

۶۔ انتیازنگ ونسل

۷۔ ملا در مدح خود مے گوید

۸۔ حقائق حیات

ان اسباب میں اکثر جگہ موضوع روایات کا ذکر کیا ہے۔ صرف پہلا باب ایسا ہے، جس میں تحریف حدیث کا ذکر کیا ہے۔ باقی تو حقیقت میں حفظ حدیث کے باب میں ذکر ہونے چاہئیں۔ کیونکہ جن لوگوں نے احادیث موضوع بنائیں، محدثین نے وضع کے اسباب آپ سے زیادہ لکھے ہیں اور ان موضوع احادیث کو الگ کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حفظ حدیث کا کیا ہی اچھا انتظام کیا۔

اب ہم ترتیب وار سب پر مختصر بحث کرتے ہیں:

پہلا سبب یہ بیان کیا ہے کہ حدیث کے لکھنے کی ممانعت کی گئی تھی، جو چیز لکھی نہ جائے وہ بدل جاتی ہے اور بالآخر مٹ جاتی ہے۔

اول تو حدیث کے لکھنے کی ممانعت کا ذکر ہی صحیح نہیں بلکہ واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ آپؐ نے احادیث خود لکھوائیں اور لکھی گئیں۔ اس پر مفصل بحث ہو چکی ہے۔

دوم، غیر مکتوب کو تحریف سے بچانے کی اور کوشش بھی ہوسکتی ہے جس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں:

۱ - اس کو روزمرہ کے عمل میں لایا جائے، جیسے اذان، اقامت پنجوقتی نماز، وضو۔
۲ - حکومت کے لئے قانون بنایا جائے جیسے قصاص و دیات، نان و نفقہ عدت، زکواۃ، عشر، خراج، جزیہ، حرمت سود، بعض بیوع اور اجاروں کی ممانعت، حدود تعزیرات، حرمت شراب میسر، میراث، وصیت، ہبہ، کفالت، امارت، تقسیم غنیمت وغیرہ - یہ صورت اس قسم کی ہے جس سے حدیث تحریف سے بچ جاتی ہے۔
۳ - حکومت کے ذمہ اس کی اشاعت و حفاظت ہو۔
۴ - یاد کرنے کی طرف لوگوں کی توجہ ہو۔
۵ - متن احکام کو الگ لکھ کر محفوظ کر لیا جائے۔ اور حدیث کو بطور بیان لیا جائے۔ اس صورت میں چونکہ متن محفوظ ہوتا ہے، احادیث بھی تبعاً محفوظ ہو جاتی ہیں - اگر غلطی سے کوئی بات بدل جائے گی تو مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر اس کا پتہ چل جائے گا جیسا کہ آپ نے "دو اسلام" میں قرآن کی آیت "واوحی هذا القرآن" کو "انما اوحی الی هذا القرآن" لکھدیا ہے اور "سبوح قدوس رب الملٰئکۃ والروح" کو قرآن کی آیت بنا دیا ہے۔ مرزا غلام احمد نے "یا ایها الذین انفقوا فی سبیل الله" قرآن کی آیت لکھی ہے اور ہزاروں کی تعداد میں آپ کی اور مرزا غلام احمد کی کتاب طبع ہو کر لوگوں کے پاس پہنچی اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جو آپ تک آپ کا "دو اسلام" دیکھ کر، ان کو قرآن کی آیات سمجھتے ہوں مگر اس سے قرآن میں تحریف نہیں ہو جاتی - اسی طرح اگر کوئی اپنی جگہ کوئی حدیث بنائے یا صحیح حدیث کو بدل دے تو اس سے نفس حدیث میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کی غلطی ہوتی ہے - حدیثوں کو قائد اعظم کی تقریر پر قیاس نہیں کر سکتے، نہ اوائل امت کو اپنے آپ پر قیاس کر سکتے ہیں - کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختصر جامع باتیں کرتے تھے اور ان کو بارہا فرمایا کرتے تھے - ایک ایک سورت اتنی بار پڑھا کرتے کہ سننے والے صرف سننے سے یاد کر لیتے - اسی طرح جو کلمہ مشکل ہوتا، اس کو دہراتے، پھر اگر کسی کو پوری تقریر یاد نہ رہتی تو جس قدر یاد ہوتی بیان کرتا - جیسے کسی کو اگر قرآن سارا

یاد نہ ہو تو جس قدر یاد ہو، اس کے حفظ پر متروک حصہ کا کچھ اثر نہیں پڑتا اور ہم یقین کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض لمبے خطبات پورے کے پورے محفوظ نہیں رہے۔ مگر ہم یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ سننے والوں نے عمداً کوئی بات بدلی ہو۔ اگر کسی نے سہواً کوئی بات غلط کہی ہے تو اس غلطی کے دور کرنے کے اسباب موجود تھے۔ اور جس قدر قرآن کے بیان اور اس پر عمل کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کی ضرورت تھی، اس قدر ہمیں محفوظ شکل میں پہنچ چکا ہے۔

پھر سننے والے عرب تھے جن کا حافظہ قدرتاً تیز تھا، ان کو اپنے آپ پر قیاس کرنا درست نہیں پھر قائد اعظم کی تقریر کی طرح ایک ہنگامی بات نہ تھی۔ بلکہ ان باتوں کو روزمرہ دہرایا جاتا تھا۔ اور ان پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس طرح فراموش شدہ حصہ کو پھر سے یاد کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

دین کی باتیں ان حوادث کی طرح نہیں جو کہیں گذرا اور اس کے متعلق لوگوں میں اختلاف ہو۔ بلکہ یہ ایک دستور العمل تھا جس کا ہماری روزمرہ کی زندگی سے تعلق تھا جس کا مرکز خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، جن کی طرف ہر سہو و نسیان کے موقع پر رجوع کیا جاتا تھا۔

دو اسلام میں ایک عجیب بات کہی گئی ہے کہ حضور علیہ السلام سے ایک بات نکلی، ہزاروں نے سنی، رفتہ رفتہ اس میں ردّ و بدل ہونے لگا۔ زمانہ گذرتا گیا اور بات بگڑتی گئی۔ ہزاروں سے نکل کر لاکھوں اور لاکھوں سے نکل کر کروڑوں زبانوں تک پہنچی، جہاں کوئی حصہ بھول گیا، پاس سے بڑھا لیا۔ اصل قول محفوظ نہیں تھا کہ مقابلہ کر کے تصحیح کر لیتے۔ راویوں میں اچھے بھی تھے اور برے بھی، مؤخر الذکر نے احادیث کو اپنی اغراض کے لئے شروع کر دیا اور بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔" (دو اسلام صـ۱۲۳)

آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جب بات کروڑوں کی زبان پر چڑھ گئی تو مختلف صورتوں میں تبدیل ہو گئی۔ بات اصل میں یہ ہے، محدثین ہر کس و ناکس سے بات سن کر اس پر اعتقاد نہیں کرتے تھے۔ بلکہ معتبر آدمیوں سے ہی بات لی جاتی تھی۔ اس کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے انکے ہاں قواعد تھے۔ جیسے قرآن کو بہت سے لوگ غلط پڑھتے ہیں اور غلط چھپ بھی جاتا ہے، لیکن محرف نہیں ہوتا۔

پھر اس کے بعد لکھتے ہیں:

"حضور کا زمانہ تھا، خود سرور کائنات بقید حیات، کہ حضرت زبیر سے ان کے بیٹے عبداللہ نے پوچھا کہ آپ روایت حدیث سے کیوں اجتناب کرتے ہیں؟ فرمایا، اللہ کی قسم احادیث میں اختلاف ہو گیا ہے۔ میں نے حضور کی زبان مبارک سے یہ حدیث ان الفاظ میں سنی تھی:

"من کذب علی فلیتبوأ مقعدہٗ من النار"

جو شخص کوئی غلط قول میری طرف منسوب کریگا، جہنم میں جائے گا، لیکن لوگوں نے اس میں "متعمداً" بڑھا دیا ہے۔

مگر اس واقعہ کی سند صحیح نہیں بلکہ زبیر سے خود متعمداً کے لفظ کے ساتھ بھی حدیث آئی ہے اور زیادہ صحابی اس لفظ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس لفظ کے بغیر کہا ہو اور کبھی اس لفظ کے ساتھ۔

آگے لکھتے ہیں:

"اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر کے سامنے حضرت ابوہریرۃ کی کتے والی حدیث بیان کی گئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مویشیوں کی رکھوالی اور کھیتی کی حفاظت کے لئے کتا پالنا جائز ہے، تو ابن عمر نے فرمایا، کیوں نہ ہو، ابوہریرۃ کھیتوں کا مالک جو ٹھہرا۔"

توجیہ: چونکہ حضرت ابوہریرہ نے اپنے کھیت کے لئے کتا پال رکھا تھا، اس لئے بقول ابن عمر آپ نے ایک حدیث تراش کر کتا پالنے کا جواز نکال لیا تھا۔" (دو اسلام ص۳۴۱)

یہاں مصنف نے ترجمہ غلط کر کے اس کا مطلب غلط لیا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے تو یہ کہا تھا کہ "ابوہریرۃؓ کی کھیتی ہے" یہ نہیں کہا "کیوں نہ ہو۔۔۔" تاکہ انکار لازم آئے۔ بلکہ عبداللہؓ بن عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ ابوہریرۃؓ کا چونکہ کھیت ہے، اس لئے ان کو اس مسئلہ کے متعلق تحقیق ہے۔ پھر ابوہریرۃؓ اس میں منفرد نہیں، اور صحابی بھی کھیت کا لفظ ذکر کرتے ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔

آگے ایک اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیتے ہیں:

ایک اعتراض:

ہمارے بعض بزرگ کہتے ہیں کہ احادیث کو چھوڑ دو گے تو نماز پڑھنے کا طریقہ کہاں سے سیکھو گے اور زکوٰۃ کی مقدار کہاں سے متعین کرو گے؟

جواب:

"اس سوال کے تین جواب ہیں، اول اگر ہم احادیث کے مطابق نماز پڑھنا شروع کر دیں تو ہر مسجد کی نماز دوسری سے مختلف ہو جائے" (دو اسلام صفحہ ۱۲۴)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حدیث میں یہ لکھا ہے کہ ہر مسجد والے الگ الگ نماز پڑھیں اور جب ایک مسجد میں جمع ہوں تو ایک ہی طرح نماز پڑھیں۔ تو حدیثی نماز میں اختلاف ہونے کے باوجود ایک مسجد میں اتفاق ہو سکتا ہے تو پھر دو مسجدوں میں بھی اتفاق ہو سکتا ہے۔ اور اگر دو مسجدوں میں نماز مختلف ہو سکتی ہے تو ایک مسجد میں بھی مختلف ہو سکتی ہے۔ اگر حدیث سے یہ ثابت ہو جائے کہ نماز ان مختلف طریقوں سے جائز ہے تو اس اختلاف میں کون سی قباحت ہو سکتی ہے؟ جب آپ مختلف شکلیں لے کر نماز میں داخل ہو سکتے ہیں، اس میں کیا حرج ہے کہ ہاتھ باندھنے یا چھوڑنے یا رفع یدین کرنے یا نہ کرنے اور آمین بالجہر کہنے یا آہستہ کہنے کے ساتھ نماز میں سب شامل ہو جائیں۔

آگے دوسری وجہ لکھتے ہیں:

دوم۔ رسول کریم کو لاکھوں مسلمانوں نے نماز پڑھتے دیکھا، انہیں کروڑوں نے، اور یہ سلسلہ ہم تک پہنچ گیا، کیا ان اربوں کھربوں مسلمانوں کی شہادت کافی نہیں؟ کیا دیہاتی مسلمان صحیح بخاری سے نماز کا طریقہ سیکھا کرتے ہیں؟ جس طریقہ سے ہمارے آباؤ اجداد نماز ادا کرتے رہے، ہم نے وہ سلسلہ جاری رکھا اور اب نئی نسل ہماری نقل کر رہی ہے یہاں صحیح بخاری کی ضرورت ہی کیا پیش آتی ہے؟ کشمیر کی ساری وادی میں صحیح بخاری کا کوئی نسخہ موجود نہ ہو گا۔ لیکن وہ پھر بھی نہایت صحت سے نماز پڑھتے ہیں" (دو اسلام صفحہ ۱۲۵)

اب سوال یہ ہے، یہ نماز جو اربوں کھربوں کی شہادت سے ثابت ہے، کیا قرآن میں اس ترتیب کو آپ اس طریقہ پر جو ہم پڑھتے ہیں، دکھا سکتے ہیں؟ اگر نہیں دکھا سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے علاوہ بھی ہم کسی چیز کو مانتے ہیں، اسی کا نام تو حدیث ہے۔ پھر نماز کا کچھ حصہ (قیام، رکوع، سجود، قعدہ، جلسہ، قومہ، ہاتھ اٹھانا اور باندھنا) محسوس یعنی دیکھا جاتا ہے اور کچھ حصہ (جماعت کی صورت تکبیرات اور سمع اللہ لمن حمدہ، السلام علیکم) سنا جاتا ہے۔ مگر کچھ نماز کا حصہ وہ بھی ہے جو نہ دیکھا جاتا ہے اور نہ سنا جاتا ہے جیسے (دعا استفتاح، سبحان ربی العظیم، ربنا لک الحمد، التحیات، درود وغیرہ) اسلئے

ضروری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا زبانی ذکر کیا ہوگا۔ پس نماز کے لئے دو قسم کی حدیث قولی و عملی ثابت ہو گئی۔ ہاں یہ بات باقی رہ جاتی ہے، نماز میں اگرچہ اس کے بہت سے حصہ میں اتفاق ہے مگر اس کے مخصوص حصہ میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ مثلاً ہاتھ باندھنے اور چھوڑنے اور رفع یدین کرنے اور نہ کرنے، آمین بالجہر کہنے اور آہستہ کہنے اور ہاتھ زیر ناف باندھنے یا اوپر باندھنے ہیں، مگر یہ امور سب کے نزدیک سنت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو طرح سے نماز پڑھی ہو۔ جس طرح کسی نے دیکھا اور آگے جا کر نماز پڑھی، پھر اس کو دیکھنے والوں سے اسی طرح طریقہ چلا آیا یہاں تک کہ یہ زمانہ آیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے صرف ہاتھ باندھکر نماز پڑھی ہو مگر دیکھنے والوں میں سے بعض نے سنت سمجھ کر غفلت کی بنا پر چھوڑ دیا ہو، پھر وہاں سے سلسلہ چل کر اس زمانہ تک پہنچ گیا ہو۔ یہی حال دوسرے امور اختلافیہ کا ہے۔ اب ایسے مقام پر بخاری اور دوسری کتب حدیث کی ضرورت پڑتی ہے کہ آیا یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے یا بعد کا تعامل ہے؟

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عورتوں کی نماز میں موجودہ زمانہ میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ پس یہ اختلاف اگر بعد کا پیدا شدہ نہیں تو ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق زبانی ہدایت دی ہو۔ پس اس صورت میں بھی حدیث قولی کا ثبوت ملتا ہے اور یہ خیال کبھی ہم کو نہیں گذرتا کہ لاکھوں نمازیوں کی زبان اور عمل پر نماز گذری، شاید کتنے تغیر اور تبدل پیدا ہوئے ہوں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز میں اگر تغیر اور تبدل ہوتا تو پڑھنے والوں میں سخت اختلاف ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں اختلاف نہیں کیونکہ بالاتفاق اس کا ایک ڈھانچہ متعین ہو چکا تھا۔ جب ایک چیز متعین ہو چکی ہو تو اس میں خواہ کتنا ہی ردّ و بدل ہو، آخر اس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ اس کی تبدیل شدہ ہیئت کا کوئی بھی حامی نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات ہے تو اسلام میں جو اجماعی مسائل ہیں جن میں کسی فرقہ کا اختلاف نہیں، ان کے بارہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں، ان کے متعلق تو یقین کر لینا چاہیئے کہ ان میں ردّ و بدل نہیں ہوا ہوگا۔ اگر کسی وقت کسی نے ردّ و بدل کی کوشش کی بھی ہو تو اس کو کسی نے بھی قبول نہ کیا ہوگا۔ باقی رہیں وہ احادیث جن کا تعلق اختلافی مسائل سے ہے، ان میں جو اجماعی الصحت یا متواترہ ہیں، ان کو قبول کر لیا جائے، باقی میں تحقیق کر لی جائے۔ اور سارا زور آپ وہاں خرچ کریں۔

اس کے بعد مصنف "دو اسلام" کی زبان میں تیسرا جواب سنیئے:

"سوم - قرآن ہر لحاظ سے ایک مکمل کتاب ہے۔ جس طرح ہم کسی تفسیر، تاریخ یا تصوف کی کتاب کو یہ منصب عطا نہیں کر سکتے کہ وہ اسلام میں کسی نئے حکم یا اصول کا اضافہ کرے اسی طرح ہم حدیث کو بھی یہ رتبہ نہیں دے سکتے۔ انسانی اقوال کی بے اندازہ آمیزش کی وجہ سے اس کی حیثیت انسانی تصنیف کی ہو چکی ہے۔ جس طرح بعض انسانی تصانیف کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قرآنی آیات و احکام کی شروح بیان کریں، اسی طرح محدثین کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ان لوگوں نے صلوٰۃ و زکوٰۃ کی کوئی ایسی تشریح کی ہے۔ جو قرآن کے خلاف نہیں تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟ لیکن ہم ان حضرات کو اسلام میں ایسے اضافے کی اجازت نہیں دے سکتے، جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود نہ ہو یا وہ انسانی عقل و فطرت اور قرآن، ہر سہ سے متصادم ہوتا ہو۔" (دو اسلام ص ۱۲۵)

اس جواب میں تو مصنف نے مسئلہ صاف کر دیا ہے کہ محدثین کو بھی تشریح کا حق ہے جیسے دوسرے مصنفین کو، مگر اضافے کا حق نہیں اور حدیث اگر قرآن کے خلاف ہو یا عقل اس کو باور نہ کرے تو وہ قابل قبول نہیں۔ حالانکہ یہ اتفاقی بات ہے کہ حدیث قرآن کا بیان اور اس کی تفسیر ہے۔ باقی مصنفین اور محدثین میں اتنا فرق ہے کہ وہ لغت وغیرہ سے تفسیر کرتے ہیں اور محدثین حدیث سے کرتے ہیں۔ اگر کسی حدیث میں کوئی ایسی بات ہے جو قرآن میں نہیں تو اس کو اضافہ نہیں کہتے، اضافہ اسے کہتے ہیں، جو اصل کے درجہ میں ہو، یعنی اس کو بھی قرآن سمجھا جائے۔ مگر حدیث کو کوئی قرآن نہیں سمجھتا۔

باقی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو بے اندازہ انسانی اقوال کی آمیزش سے الگ کرنے کا طریقہ ہم بارہا بتلا چکے ہیں۔ جیسے مصنف نے نماز کے متعلق حدیث کو تسلیم کیا ہے، اسی طرح اگر زکوٰۃ سے متعلق تسلیم کر لیتے تو اچھا تھا۔ کیونکہ دونوں مسئلے تواتر عملی سے ثابت ہیں بلکہ زکوٰۃ کے متعلق تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر بھی موجود رہی ہے۔ اور اسلامی حکومت کے آئین میں اس کا داخل ہونا بھی اس کے متعین اور غیر محرف ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ مگر اس کے متعلق مصنف "دو اسلام" لکھتے ہیں:

"باقی رہا زکوٰۃ کا مسئلہ، تو اسے خود قرآن نے بھی واضح کر دیا ہے، زکوٰۃ ہے کیا چیز؟ اللہ کے راستہ میں مالی قربانی۔" (دو اسلام ص ۱۲۶)

اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات ہیں:

قرآن نے زکوٰۃ اور اللہ کے راستے میں مالی قربانی کا الگ الگ ذکر کیا ہے، فرمایا:

"وآتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ الآیۃ (البقرۃ)

بہترین مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں اور غلاموں کی آزادی میں خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔

اس آیت میں مالی قربانی کا الگ ذکر کیا ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا الگ بیان فرمایا ہے۔

سورۂ مزمل میں فرمایا:

"واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ واقرضوا اللہ قرضاً حسناً" الآیۃ

کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو اچھا قرض دو۔

عام طور پر قرآن مجید قتال فی سبیل اللہ میں خرچ کرنے کو قرض سے تعبیر کرتا ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ اور الحدید میں ہے۔

مالی قربانی دو قسم کی ہے، ایک متعین اور دوسری غیر متعین۔ متعین کو عرف میں زکوٰۃ کہتے ہیں اور غیر متعین کو زکوٰۃ نہیں کہتے اگرچہ لغت کے اعتبار سے اس پر زکوٰۃ کا اطلاق ہوسکتا ہے پھر زکوٰۃ دائمی فریضہ ہے اور وقتی صدقات کی کوئی حد نہیں، کیونکہ اس کا مقصد وقتی ضرورت کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وقتی ضرورت اپنے ضروریات سے زائد تمام مال خرچ کرنے سے پوری ہوتی ہو تو اس وقت یہی حکم ہے کہ سب خرچ کرو۔ قضیہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کا یہ حل نہیں کہ بالکل جمع کرنے سے روک دیا جائے۔ ورنہ میراث، وصیت اور خرچ کرنے کا مقصد ہی مفقود ہو جائیگا۔ بلکہ اس کا حل یہ ہے، فقراء و مساکین کی ضروریات (کھانا پینا، پہننا، سکونت، نکاح، علاج، تعلیم وغیرہ) کا پورا بندوبست کیا جائے۔ اگر زکوٰۃ سے بندوبست ہو جائے تو فبہا، ورنہ تمام زائد مال تک اس میں خرچ کر دیا جائے۔ یہی قرآن سے ثابت ہے اور یہی حدیث میں ہے۔ جب تمام مال زائد کا خرچ کرنا وقتی ٹھہرا تو اس کو دائمی فرض نہیں بنا سکتے، اور دائمی فرض ہمیشہ متعین ہوا کرتا ہے، وقتی فرض متعین نہیں ہوتا، اس کا تعین حاجت کے اندازے پر ہوتا ہے۔ پس لازمی طور پر زکوٰۃ متعین ہونی چاہیئے۔